جمہوریت اور اسکے تناظر میں برپا اسلامی جدوجہد کا تنقیدی جائزہ

محمد زاہد صدیق مغل

(دوسری قسط)

اہم رجال کار کا ضیاع:

جمہوری جدوجہد کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ایسے ذہین کارکنان جو غلبہ و انقلاب اسلامی کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں تحریکات اسلامی کو حقوق کی لایعنی جمہوری سیاست کرتے دیکھ کر یا تو انتشار ذہنی کا شکار ہوجاتے ہیں اور یا پھر دل برداشتہ ہوکر تحریک سے علیحدگی اختیار کرلیتے ہیں اور یوں دینی تحریکیں اپنے مخلص کارکنان سے محروم ہوجاتی ہیں۔

آگے بڑھنے سے قبل اب تک کی گئی بحث کا خلاصہ ذیل کی شکل میں دیکھ لیجئے۔

لبرل جمہوریت کا عمومی خاکہ

۲.۲: اسلامی جمہوریت کے اہم دلائل کا تجزیہ:

ہیومن رائٹس اور جمہوریت کے تناظر میں اسلامی جدوجہد مرتب کرنے کیلئے کئی ایسی دلیلیں وضع کرلی گئی ہیں جو درحقیقت دلیل سے زیادہ غلط فہمیوں اور تاویلات فاسدہ کا پلندہ ہیں۔ ذیل میں ایسے چند دلائل کا مختصر تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

دائرہ شریعت کی پابند جمہوریت:

اسلامی جمہوری عمل کے جواز کیلئے ایک اہم دلیل یہ دی جاتی ہے کہ جمہوری عمل کو پابندی شریعت کے ساتھ مشروط کردیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اسمیں کوئی حرج نہیں بلکہ یہی اسلام کا اصل

مطلوب سیاسی نظام ہے۔ چنانچہ مسلم مفکرین کے مطابق جمہوریت کی اس اسلامی تعبیر کے اندر افراد کو عمل لواطت کا حق حاصل نہیں ہوگا کیونکہ یہ عمل شرع کے خلاف ہے۔ عوامی رائے اور ہیومن رائٹس کی عمل داری کو دائرہ شریعت کے اندر محصور کردینے کو اسلامی جمہوریت وغیرہ کا نام دے دیا گیا ہے۔ دائرہ شریعت کی پابند جمہوریت ایک مبہم اصطلاح ہے جسکے متعدد معنی ہوسکتے ہیں۔ اسکی ایک تشریح یہ ہوسکتی ہے کہ عوامی نمائندے عوامی رائے کی روشنی میں نصوص شریعہ کی تعبیر کریں گے۔ ظاہر ہے یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کیونکہ نصوص شریعہ کی تشریح وتعبیر مجتہدین وعلمائے کرام کا کام ہے اور علماء عوامی نمائندے نہیں بلکہ انبیاء کے ورثاء ہوتے ہیں۔ فقہ اسلامی کی تاریخ میں ایک بھی مثال ایسی نہیں دی جاسکتی جس میں اجتہاد کی ذمہ داری عوامی نمائندوں کے سپرد کردی گئی ہو۔ عوامی نمائندگی کے بجائے اسلامی نظریہ ریاست 'تقلید' کے اصول پر قائم ہے یعنی عوام الناس کا کام یہ نہیں کہ وہ اپنی خواہشات پر عمل پیرا ہونے کیلئے قانون سازی کریں بلکہ ان پر لازم ہے کہ اپنے نفس کو تعلیمات شریعت کے تابع کرنے کیلئے کسی مجتہد کی رائے پر عمل کریں۔ عوامی رائے کی روشنی میں نصوص شریعہ کی تعبیر کا مطلب نہ صرف اصول تقلید کو بلکہ اصول اجتہاد وفقہ کو بھی کالعدم قرار دینا ہے کیونکہ اگر شریعت کی تعبیر عوامی رائے کے مطابق ہونی ہے تو پھر شارع کی رضا معلوم کرنے کیلئے اصول وضع کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے فقہاء تو تلہی وہوائے نفس (کسی فقہی رائے کو قوت دلیل کے بجائے ذاتی اغراض پورا کرنے کیلئے اپنانے) اور تلفیق (مختلف فقہی آراء کو ملا کر ایسی شکل بنانا جو سب کے نزدیک ناجائز ہو) کے خطرات کی بناء پر عوام الناس کو مختلف فقہی مکاتب فکر کی آراء اپنانے کا حق دینے پر تیار نہیں جبکہ اسکے برعکس اسلامی جمہوریت کی یہ تعبیر عوام کو نصوص شریعت کی تعبیر کرنے کا حق دینے کی بات کرتی ہے، فیاللعجب۔ جمہوریت کی اس اسلامی تعبیر کا مطلب عوام پرستی کے سواء اور کچھ نہیں، یعنی عوام شرع کی جو بھی تعبیر کرنا چاہیں کرلیں اور وہ تعبیر لازماً حق ہوگی نیز نام کے مسلمانوں کی اجتماعی خواہشات اور احکام شریعت ایک ہی چیز ہیں۔ ظاہر بات ہے ارادہ انسانی کو خدا کی مرضی کا مظہر قرار دینے کی اسلامی علمیت میں کوئی گنجائش موجود نہیں۔

اسلامی جمہوریت کی دوسری ممکنہ تشریح یہ کی جاسکتی (اور اکثر کی جاتی) ہے کہ عوام کی مرضی کے مطابق قانون سازی صرف ان معاملات میں کی جائے گی جہاں شریعت خاموش ہے۔ یہ

اصول اس مفروضے پر قائم ہے کہ اسلامی ریاست صرف قرآن و سنت کے خلاف فیصلہ 'نہ' کرنے کی پابند ہوتی ہے جبکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست ہر فیصلہ قرآن وسنت اور اسلامی علمیت کی روشنی میں 'کرنے' کی پابند ہوتی ہے۔ شرع کے دائرے کو تشکیل قانون میں صرف اس حد تک محدود کرنا کہ قانون کا کوئی فیصلہ شرع کے خلاف نہ ہو اس مفروضے پر مبنی ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی دائرہ عمل ایسا بھی ہے جہاں شارع نے انسان کو اپنی خواہشات پر چلنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا ہے نیز قانون کا دائرہ شرع کے دائرے سے وسیع تر ہے۔ حقیقت حال اسکے عین برعکس ہے کہ شریعت ہمیں ہر معاملے کا حکم قرآن وسنت کی روشنی میں طے کرنے کا طریقہ بتاتی ہے اور اسلامی ریاست کا یہ وظیفہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن وسنت پر مبنی اہل الرائے کے مشورے سے تمام معاملات پر حکم لگائے۔ شرع محض فرائض، واجبات اور محرمات کا ہی نام نہیں بلکہ اس کا دائرہ سنن، مندوب، مستحب، مکروہ، اساءت و خلاف اولی کے درجات تک اسطرح پھیلا ہوا ہے کہ پیدائش سے لیکر موت تک کوئی ادنی سے ادنی انسانی فعل بھی اسکی گرفت سے باہر نہیں۔ اسلامی جمہوریت کی یہ تعبیر کرنے والے حضرات فقہ اسلامی کا ناقص تصور قائم کرکے یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام محض چند گنے چنے مخصوص اعمال و افعال (Fixed Do's and Don'ts) کے مجموعے کا نام نہیں، بلکہ اسلام ایک علمیت (epistemology) ہے اور علمیت محض مخصوص اعمال نہیں بلکہ تمام انسانی اعمال کو مخصوص مقاصد کے ماتحت کردینے کا طریقہ بتاتی ہے۔ کسی معاملے میں واضح نص کے نہ ہونے کا مطلب یہ کہاں سے نکل آیا کہ ان معاملات میں 'عوامی خواہشات' کے مطابق فیصلے کئے جائیں گے؟ آخر کس فقیہ نے 'عوامی رائے وخواہشات' یا 'انسانی فطرت' وغیرہ کو مصادر شریعت قرار دیا ہے؟ اگر شریعت چند گنے چنے اعمال کا نام ہے تو آج بھی مدارس میں اصول فقہ کیوں پڑھائے جاتے ہیں؟ آخر انہیں پڑھانے کا مقصد اسکے سواء اور کیا ہے کہ علماء کرام نئے پیش آنے والے مسائل کو مقاصد الشریعہ کی روشنی میں حل کرسکیں؟

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جہاں شریعت خاموش ہے تو وہاں فیصلے کس علمیت کی بنیاد پر ہونگے؟ ظاہر بات ہے اگر اس دائرے میں اسلامی علمیت کوئی راہنمائی فراہم نہیں کرتی تو لازماً فیصلے کسی غیر اسلامی علمیت کی بناء پر ہونگے اور دور حاضر

میں وہ علمیت سائنس (بشمول فزیکل اور سوشل سائنسز) کے علاوہ کچھ بھی نہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ فیصلے سائنسی علمیت کی بنیاد پر ہونگے۔ معاشرتی و ریاستی فیصلوں کو سائنسی علمیت کے سپرد کرنے کا مطلب یہ مان لینا ہے کہ (الف) اصل علمیت تو سائنس ہے کیونکہ یہی تمام معاملات میں حکم لگانے کی بنیاد فراہم کرتی ہے، (ب) ریاستی فیصلوں کا مقصد سرمایہ دارانہ مقاصد کا حصول ہے کیونکہ سائنس ہر گز بھی کوئی غیر اقداری علمیت نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ مقاصد زندگی کے حصول کو ممکن بنانے کی علمیت ہے (سائنسی علمیت پر راقم الحروف کے مضمون کیلئے دیکھئے ماہنامہ الشریعہ، مئی ۲۰۰۸)۔ خوب یاد رہے کہ اسلامی جمہوریت کی اس تعبیر کو مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم مان لیں کہ اسلام سرے سے کوئی علمیت ہے ہی نہیں بلکہ محض ایک رویہ (attitude) ہے جس کا اظہار کسی بھی نظام زندگی اور علمیت کے اندر ممکن ہے۔ اگر اسلام علمیت نہیں تو (الف) اسلامی نظام زندگی کی فوقیت پر اصرار کرنا ایک لغو دعوی ہے، (ب) اسلامی ریاست ہرگز بھی کوئی مذہبی ریاست نہیں ہوسکتی اور (ج) ریاستی عمل کی شرع مطہرہ کے تناظر میں تحدید ایک لایعنی اصول بن کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کو علمیت مانے بغیر وہ بنیاد ہی فراہم نہیں کی جاسکتی جس کی روشنی میں فیصلے شارع کی مرضی کے مطابق کئے جاتے ہیں۔ پس طے کرنے کی بات یہ نہیں کہ کوئی فیصلہ شرع کے خلاف نہ ہو بلکہ یہ ہے کہ ہر فیصلہ شرع کے تقاضوں کے مطابق ہو کیونکہ اول الذکر رویہ شرع کو فرائض اور محرمات کی چند مخصوص تفصیلات تک محدود کردیتا ہے ۔یہیں سے یہ بات واضح ہوجانی چاہئے کہ ہر حالت میں اسلامی ریاست کے اقتدار کے اصل حقدار علماء کرام ہی ہیں کیونکہ وہی اس علمیت کے وارث ہیں جو فیصلوں کو شارع کی مرضی کے تابع کرتی ہے۔ ہمیں یہ بات ماننے اور کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنی چاہئے کہ اسلام میں 'ملائیت' (Theocracy) ہے، ان معنی میں نہیں کہ اسلام میں پاپائیت کی طرح علماء کی کوئی تنظیمی ہیئت (organizational hirarchy) ہے بلکہ ان معنی میں کہ اسلامی ریاست میں فیصلے وہی لوگ کرتے ہیں جو اسلامی علمیت کے ماہرین ہیں اور جنہیں 'مولوی' کہا جاتا ہے۔ ریاستی فیصلوں پر کسی ایک گروہ کی اجارہ داری صرف مذہبی معاشروں میں ہی نہیں ہوتی بلکہ جمہوری ریاستوں میں بھی ہوتی ہے کیونکہ عملاً وہاں بھی فیصلے وہی لوگ کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ یا سائنسی علمیت کے ماہرین ہوتے ہیں اور جو آزادی یعنی سرمائے میں لامحدود اضافہ کرنے کا علم رکھتے ہیں، مثلاً سوشل سائنسز اور

بزنس ایڈمنسٹریشن کے ماہرین، قانون دان وغیرہ (اس نقطے کی تفصیلی وضاحت کیلئے دیکھئے جمہوریت پر راقم الحروف کا مضمون: ساحل نومبر ۲۰۰۶)۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ جمہوریت میں ان فیصلوں کی توثیق بالآخر عوام ہی کرتے ہیں کیونکہ فیصلوں کا اصل مقصد تو عوامی خواہشات واغراض کی تکمیل ہی ہوتا ہے اور وہی یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ آیا انہیں فیصلوں سے 'مزہ آیا' یا نہیں۔ اسلامی نظریہ ریاست کو جمہوری تناظر میں بیان کرنے والے مفکرین یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جمہوریت جس بنیاد پر حکمرانوں کے چناؤ کا حق افراد سے مختص کرتی ہے وہ یہ مفروضہ ہے کہ 'ہر فرد اپنا حاکم خود ہے (citizen is sovereign)' لہذا 'حکمرانی کی بنیاد عوامی نمائندگی ہے'، اور اسی وجہ سے یہ ہر فرد کا حق ہے کہ ایسا حاکم چنے جو اسکے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ ظاہر بات ہے اس مفروضے کی اسلامی علمیت میں کوئی دلیل موجود نہیں کیونکہ شرع کے فیصلوں کی عوامی توثیق کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسلامی نظریہ ریاست میں حکمرانی کی بنیاد یہ ہے ہی نہیں کہ 'عوام کیا چاہتے ہیں' بلکہ یہاں تو حکمرانی اس لئے کی جاتی ہے کہ عوام کی چاہتوں کو شارع کی رضا کے تابع کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ عوام تو بالعموم اغراض اور مفادات ہی کی بنیاد پر فیصلے کرتے ہیں نہ کہ شارع کی مرضی کے تقاضوں کے مطابق۔ گو کہ اس اتفاقی امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ کسی معاشرے کے عوام اتنے نیک ہوں یا کسی مخصوص حالات میں اچانک وہ اظہار وغلبہ اسلام ہی کو اپنی اول چاہت (first order desire) سمجھیں لیکن جمہوریت وہ طریقہ نہیں ہے جو افراد کو اپنی چاہت 'خدا کے سپرد' کر دینے کیلئے تیار کرتی ہو بلکہ یہ تو وہ طریقہ ہے جو افراد کو 'اپنی خواہشات پر عمل' کرنے پر اکساتی ہے۔ **نفس لوامة** کے تقاضے پورے کرنے کا طریقہ جمہوریت نہیں بلکہ پیری مریدی ہے کیونکہ عوامی نمائندگی (representation) **نفس عمارة** یعنی عوام کو معصیت اور اسکی توجیہہ بجھانے کا طریقہ ہے۔ مدرسے کے کسی نالائق استاد کو درست کرنے کیلئے طلباء کو اساتذہ کے خلاف تنظیم سازی کر کے سیاست کرنے کی اجازت دینا تعلیمی مقاصد کے حصول وفروغ کا ذریعہ نہیں بلکہ اسکی راہ میں رکاوٹ ہی بنتا ہے۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ جمہوریت مقاصد الشریعہ کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہے تو ان ممالک کا حال دیکھ لے جہاں جمہوری قدریں مضبوط ہیں۔ اس سے بھی واضح مثال ایران کی دیکھ لیجئے جہاں باوجود اسکے کہ جمہوری عمل محدود ہے آج امام خمینی جیسی ہیئت کے بجائے پینٹ کوٹ میں ملبوس صدر برسر اقتدار ہے۔ جہاں

حال یہ تھا کہ امام خمینی کے نامزد کردہ نمائندے کے خلاف تو ایک بھی امیدوار سامنے نہ آیا مگر آج وہاں اسی (۸۰) سے زیادہ عوامی نمائندے سامنے آگئے ہیں اور اگر ایران اس جمہوریت سے چمٹا رہا تو وہ دن دور نہیں جب دنیا لادینی طاقتوں کو ایران میں برسر اقتدار دیکھے گی۔

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ دائرہ شریعت کے اندر رہتے ہوئے عوامی حاکیت کا تصور سرمایہ دارانہ اہداف (آزادی، مساوات وترقی) کا رد نہیں بلکہ دائرہ اسلام کے اندر رہتے ہوئے ان کے حصول کی حکمت عملی طے کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس حکمت عملی کے تحت انسانی آزادی یعنی سرمائے کی بڑھوتری کا جواز پابندی شریعت کی شرط کے ساتھ فراہم کیا جاتا ہے۔ اس اصول کے مطابق ہم اسلام کو بطور مستقل نظام زندگی نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر بطور چند حدود (limiting constraints) کے شامل (treat) کرتے ہیں جسکا لازمی نتیجہ سرمایہ داری کا اسلام پر غلبہ ہوتا ہے اور نام نہاد اسلامی تحدیدات آہستہ آہستہ سکڑتی چلی جاتی ہیں۔ اس عمل کی تفصیل نام نہاد اسلامی معاشیات کی مثال سے واضح ہوجاتی ہے جسکے پیچھے 'دائرہ شریعت کی پابند معاشیات یا سرمایہ داری' کا فلسفہ ہی مار فرما ہے۔ اسلامی معاشیات کے ماہرین معاشیات کے اس مفروضے کو قبول کرتے ہیں کہ فرد کی خواہشات لامحدود ہونی چاہئیں اور اسے عمل صرف مزے لینے (utility maximization) کیلئے ہی کرنا چاہئے (دیکھئے مولانا تقی عثمانی صاحب کی کتاب 'اسلام اور جدید معیشت وتجارت') لیکن اسے یہ لامحدود خواہشات پوری کرنے کیلئے ایسا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے جس سے معاشرے کی مجموعی لذت (aggregate utility OR social welfare) میں کمی نہ ہو۔ لذت پرستی کے اس فریم ورک کو اسلامی ماہرین معاشیات فطری مان کر اس میں چند اسلامی تحدیدات تجویز کرتے ہیں (مثلاً یہ کہ صارف حرام اشیاء استعمال نہ کرے) جنکے بعد انکے خیال میں معاشرے میں حقیقی لذت پرستی ممکن ہو سکے گی۔ اسی طرح اسلامی معاشیات یہ مفروضہ مانتی ہے کہ کاروبار کا اصل مقصد تو نفع خوری (profit maximization) ہی ہونا چاہئے البتہ یہ نفع خوری معاشرے کے مجموعی مفاد اور نفع کی قیمت پر نہیں ہونی چاہئے لہٰذا ضروری ہے کہ نفع خوری کے جذبات کو چند ضروری اسلامی تحدیدات کا پابند بنایا جائے جسکے بعد ہی معاشرے میں صحیح معنی میں سرمائے میں اضافے اور ترقی کا عمل تیز ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشیات ہر شخص کا یہ حق فطری

تصور کرتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سرمائے میں اضافے کی جدوجہد کرے البتہ وہ سرمائے میں اس طرح اضافہ نہ کرے جس کی شرع اجازت نہ دیتی ہو۔ مثلاً وہ چاہے تو زر کا بازار یعنی بینک تو بنائے البتہ سودی کاروبار کرنے کے بجائے شرعی حیلے استعمال کر کے جائز طریقے سے سرمایہ دارانہ معاشرت کو فروغ دے، ایسے ہی سٹے کے بازار یعنی اسٹاک ایکسچینج میں شرعی اصولوں کے مطابق سٹے بازی کو فروغ دے۔ اسی طرح فرد کو چاہئے کہ وہ زہد وفقر کی اقدار اپنانے کے بجائے دنیا سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونے کیلئے خوب عمل صرف (consumption) کرے ہاں حرام اشیاء استعمال نہ کرے نیز وہ کاروبار کو اللہ تعالی کی رضا یا آخرت کا گھر کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کیلئے کرے البتہ حرام اشیاء کی پیداوار کا باعث نہ بنے وغیرہ۔ اس تفصیل سے عین واضح ہے کہ اسلامی تحدیدات (constraints) لگانے کا مقصد سرمایہ دارانہ اہداف (لذت پرستی، نفع خوری وسرمائے میں اضافے) کا رد نہیں بلکہ اسکے حصول کا درست طریقہ کار ہے جو ان مفکرین کے خیال میں اسلام فراہم کرتا ہے۔ یعنی جو چیز اسلامی معاشیات کے ایجنٹ (economic agent) کو موجودہ معاشیات کے ایجنٹ سے ممیز کرتی ہے وہ انکی زندگی کے اہداف کا فرق نہیں بلکہ یہ ہے کہ اسلامی صارف طویل المدت (Long term) لذت پرستی کیلئے قلیل المدت (Short term) لذت پرستی کے رویے کو ترک کردیتا ہے، گویا وہ ایک عمدہ لذت پرست ہوتا ہے (اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اسلامی ماہرین معاشیات دراصل Rule utilitarianism فلسفے پر عمل پیرا ہیں)۔ اسلامی معاشیات کے تخیال میں اسلامی تعلیمات (مثلاً سود کی ممانعت ونظام زکوۃ کے اجراء وغیرہ) پر صحیح معنی میں عمل کرنے کا ثمر یہ ہوگا کہ معاشرے میں زیادہ سے زیادہ لذت پرستی کے مواقع فراہم ہو جائیں گے اور 'اصل ترقی' تب ہی ممکن ہوگی جب اسلامی تحدیدات کے اندر رہتے ہوئے لذت پرستی اور نفع خوری کے مجموعی عمل کو فروغ دیا جائے گا۔ گویا لبرل مفکر کانٹ کی Kingdom of Ends اور اشتراکی مفکر مارکس کی Marxist Utopia کا خواب صحیح معنی میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے بعد شرمندہ تعبیر ہوگا جہاں ہر فرد کو جو وہ چاہے گا میسر ہو سکے گا۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی ماہرین معاشیات یہ کہتے ہیں کہ سرمایہ داری اپنے لئے جو ہدف (عمل تکاثر) مقرر کرتی ہے وہ تو عین حق ہے البتہ اسکے حصول کا درست طریقہ وہ نہیں جو معاشیات کا مضمون بتاتا ہے بلکہ اسکا اصل طریقہ تو اسلام کے پاس

چودہ سو سال سے محفوظ ہے۔ اس حکمت عملی کو اپناتے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کے ذریعے وہ سرمایہ دارانہ اخلاقیات مثلاً لذت پرستی، حرص وحسد، شہوت، مادی مفادات کی فوقیت وغیرہ کا اسلامی جواز فراہم کررہے ہیں کیونکہ اگر اسلام کا ہدف بھی ترقی اور سرمائے کی بڑھوتری ہی ہے نیز انسان کی خواہشات لامحدود ہونی چاہئیں تو ماننا پڑے گا کہ اسلام بھی لذت پرستی اور حرص وحسد جیسے رزائل نفس کے فروغ کی تعلیم دیتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس حکمت عملی کا خوبصورت نام 'Shariah compliance' (اصول شریعہ سے ہم آہنگی) رکھ لیا گیا ہے جسکا مطلب 'دائرہ شریعت کی پابند سرمایہ داری' ہے۔ اسلامی ماہرین معاشیات پر امید ہیں کہ اس حکمت عملی کے نتیجے میں 'اسلام' کا فروغ ہوگا۔ اپنے آپ کو دھوکہ دینے کی اس سے بہترین مثال شاید ہی کوئی دی جاسکے کیونکہ اس لائحہ عمل کا مقصد سرمایہ دارانہ نظم اجتماعی کا انہدام (Destruction) نہیں بلکہ اسکی اسلامی تطہیر (Reconstruction) اور سرمایہ داری کی اسلامی توجیہہ (Islamic version of capitalism) تیار کرنا ہے۔ یہ حکمت عملی اپنانے والے مفکرین کبھی اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ اس نام نہاد Shariah compliance کے نتیجے میں جو انفرادیت ومعاشرت عام ہورہی ہے وہ اسلامی ہے یا سرمایہ دارانہ؟ آخر کیا وجہ ہے کہ حکمت عملی تو استعمال ہو اسلامی، مگر فروغ ہو سرمایہ داری کا؟ اس حکمت عملی کو اپنانے والے ماہرین یا تو سرمایہ داری سے ناواقف ہیں اور یا پھر اسلام سے۔ خوب یاد رہے کہ اسلام کے اندر رہتے ہوئے جمہوریت کا فروغ مقاصد الشریعہ، تزکیے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ کا نہیں بلکہ حقوق، اغراض و بڑھوتری سرمائے کے فروغ کا ہم معنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اسلامی بینکاری اور سودی بینکاری کے کاروبار میں مماثلت بڑھتی چلی جارہی ہے اور ہر آنے والے دن کے ساتھ حرام قرار دی جانے والی زری (financial) پراڈکٹس کی فہرست شرعی حیلے استعمال کرکے سکڑتی چلی جارہی ہے۔

حکم مشاورت سے جمہوریت کا اثبات:

اسلامی جمہوریت کے اثبات کیلئے وامرھم شوری بینھم (مسلمان اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں، شوری ۴۲: ۳۸) قرآنی آیت کا استعمال بے دریغ کیا جاتا ہے۔

اس آیت سے اسلامی جمہوریت کا اثبات ان مفروضات پر مبنی ہے کہ (الف) فیصلہ کرنے کا اصل حق عوام الناس کا ہے، (ب) جمہوری عمل مشورے ہی کی ایک شکل ہے، (ج) قرآنی آیت میں جس مشورے کا حکم دیا گیا ہے اسکا تقاضا پورا کرنے کا مناسب ترین طریقہ عوامی نمائندگی کی بنیاد پر مبنی جمہوری عمل ہے، (د) مشورہ کرنے والے تمام افراد اصولاً برابر حیثیت رکھتے ہیں، (ہ) مشورہ دینے والوں کیلئے کسی مخصوص علمی لیاقت اور صلاحیت سے متصف ہونا لازم نہیں۔ ظاہر بات ہے جب یہ تمام مفروضات ہی سرے سے غلط ہیں تو ان پر قائم شدہ استدلال کی حیثیت کیا ہوگی؟ ان مفروضات کے علاوہ اس آیت سے اسلامی جمہوریت کا اثبات کئی لحاظ سے مبہم اور کمزور استدلال ہے۔ اولاً اس آیت سے جمہوریت کا اثبات اسکے لفظی عمومی مفہوم پر مبنی ہے جبکہ آیت کو اسکے لفظی عموم پر محمول کرنا ممکن ہی نہیں کیونکہ اس صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ 'مسلمانوں کے تمام معاملات سب مسلمانوں کے مشورے سے طے ہوتے ہیں'۔ ظاہر ہے یہ معنی لینا محال ہے کیونکہ اگر سارے معاملات ہی مشورے سے طے ہونا مقصود تھے تو نزول شریعت عبث ہوئی اور اللہ تعالیٰ بے شمار احکامات نازل کرنے کے بجائے صرف ایک ہی سنہرا اصول نازل کر دیتا کہ 'مسلمانو تمہیں جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہو آپس میں مشورہ کر کے اسے حل کرلیا کرو'۔ پھر عوامی نمائندگی کی بنیاد پر فیصلے کرنے کا اصول کسی بھی طرح آیت کے لفظی عموم پر پورا نہیں اترتا وہ ایسے کہ یہاں لفظ بینھم میں ھم کا تقاضا یہ ہے کہ 'تمام مسلمان' 'ہر فیصلے' میں شریک ہوں جبکہ عوامی نمائندگی پر مبنی جمہوریت میں ہرگز بھی تمام مسلمان ہر فیصلے میں عملاً شامل نہیں کئے جاتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس آیت کا معنی عمومی نہیں بلکہ اسکا مقصود صرف یہ ہے کہ حکمرانوں کے چناؤ نیز صرف ان اجتماعی معاملات میں مشورہ کیا جائے جہاں نصوص شریعت خاموش ہیں تو یہ بتایا جائے کہ اس تخصیص کی دلیل کیا ہے؟ نیز آیت کے اس مقید مفہوم سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ ہر ہر کس وناکس اس مشورے میں شامل ہو جائے؟ اگر آیت کے معنی عمومی نہیں بلکہ مقید ہی مطلوب ہیں تو پھر یہ معنی کیوں نہ سمجھے جائیں کہ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اہل الرائے افراد خلیفہ کا تقرر باہمی مشورے سے کریں نیز خلیفہ کو چاہئے کہ انتظامی و انطباقی معاملات (administrative and implimentative issues) اہل الرائے وغیرہ کے مشورے سے طے کرے۔ آیت کی یہ تشریح نہ صرف یہ کہ متقدمین مفسرین کرام کے اقوال کے

عین مطابق ہے (مثلاً دیکھئے تفسیر روح المعانی، جلد ۲۵) بلکہ قرین قیاس بھی کیونکہ دنیا کا ہر ذی شعور انسان مشورہ مخصوص صلاحیت کے حامل افراد سے ہی لیا کرتا ہے۔ کیا کسی یونیورسٹی کے ڈین کا تعین کرتے وقت یونیورسٹی کے کلرک یا چپڑاسیوں سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں، جسکی وجہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کا ڈین متعین کرنے کا مقصد مخصوص مقاصد کا حصول ہوا کرتا ہے لہذا اسکا تعین وہی افراد کرتے ہیں جو ان مقاصد اور اسکے حصول کیلئے مطلوبہ صلاحیتوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مدرسے اور یونیورسٹی کا استاد مقرر کرتے وقت تو 'طلباء کی رائے' کی فکر نہیں کی جاتی کہ وہ ابھی نادان و ناسمجھ ہیں اور اپنے اچھے برے کو نہیں سمجھتے لیکن خلیفہ کی تقرری کے وقت نہ صرف انہیں 'نادان و ناسمجھ' طلباء بلکہ ان سے بھی گئے گزرے افراد کو 'ملت کے معمار' تصور کر لینا کہاں کی عقل مندی ہے؟ کیا خلیفہ کی تقرری کوئی ایسا ہی فضول کام ہے کہ ہر ہر کس و ناکس اس کا اہل ہوسکتا ہے؟ کیا خلیفہ کی تقرری کوئی حق ہے یا فرض؟ اگر یہ فرض ہے تو کیا ہر فرض کی ادائیگی کیلئے کسی صلاحیت کا ہونا لازم نہیں ہوتا؟ جیسا کہ اوپر بتایا گیا کہ مسلم مفکرین کی غلطی جمہوریت کا یہ بنیادی مفروضہ مان لینا ہے کہ 'ہر فرد اپنا حاکم خود ہے' لہذا 'حکمرانی کی بنیاد عوامی نمائندگی ہے' اور یہ ایک غلط مفروضہ ہے۔

جدید مفکرین کا مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ فرض کر رکھا ہے کہ ملوکیت لازماً بری اور غیر اسلامی شے ہے اور اسلام کا 'اصلی' سیاسی نظام جمہوری اقدار کے ہم معنی ہے۔ اس مفروضے کی صداقت پر انہیں اتنا یقین ہے کہ اسکے حق میں کوئی قطعی شرعی نص پیش کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے اور محض قیاس آرائیوں کے زور پر بڑے بڑے نتیجے اخذ کر لیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید کی کسی ایک آیت یا رسول اللہ ﷺ کی کسی ایک بھی حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ ملوکیت حرام ہے اور اس سے بچو۔ حیرت ہے جو قرآن مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی تنظیم میں سود و زنا کو علی الاعلان حرام قرار دیتا ہے وہی قرآن سیاسی تنظیم کے سب سے بڑے مزعومہ شر یعنی ملوکیت کی حرمت بیان کرنے پر مکمل طور پر خاموش ہے۔ قرآن سے ملوکیت کی حرمت ثابت کرنا تو رہا درکنار خود قرآن مجید سے اسکا ثبوت ملتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں کئی انبیاء کرام کا طلب ملوکیت کیلئے دعا فرمانا ذکر ہے اور اللہ تعالی نے انہیں اس دعا کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ اس سے بھی بڑھ کر قرآن ملوک کی تعریف کرتا ہے جیسا

کہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے ذکر خیر سے واضح ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ ایسے تمام مفکرین تضاد بیانی کرتے ہوئے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دور حکومت کو خلافت راشدہ کے مثل مانتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپؒ بھی تو ایک ملک ہی تھے پھر انکی تعریف کے کیا معنی؟

Plurality of goods بطور ایک اسلامی قدر

جمہوری مسلم مفکرین کا ایک مسئلہ اسلام کو plurality of goods اور ملٹی کلچرلزم جیسے ابلیسی تصورات کا محافظ سمجھنا بھی ہے (ملٹی کلچرلزم کے تنقیدی جائزے کیلئے دیکھئے راقم الحروف کا مضمون، ماہنامہ ساحل ستمبر ۲۰۰۷)۔ یہ بات تو ہر معمولی ذہن رکھنے والا شخص بھی سمجھتا ہے کہ دنیا کا کوئی صحیح الدماغ شخص جس شے کو حق اور جسے باطل گردانتا ہے ان دونوں کو کبھی اپنی زندگی میں مساوی حیثیت نہیں دیتا اور نہ ہی انہیں پنپنے کے برابر مواقع فراہم کرتا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص مکان تعمیر کرے اور اسمیں بجلی کے دوطرح کے کنکشن اور تاریں لگوائے، ایک تو وہ جسکے کے آگے سوئچ بورڈ اور بٹن لگے ہوں، اور دوسرے اسی دیوار میں کئی مقامات پر بجلی کی تاریں کھلی چھوڑ کر یہ کہتا پھرے کہ میں نے اپنے بچوں کو پوری آزادی دے دی ہے، چاہیں تو سوئچ بورڈ سے پنکھا چلائیں اور اگر چاہیں تو ننگی تاروں کو ہاتھ لگا کر کرنٹ سے مرجائیں۔ ایسے ہی ایک منزل سے نیچے دوسری میں جانے کیلئے ایک سیڑھی بنادے، اور اسکے ساتھ بلندی سے گر کر مرنے کیلئے تین راستے بھی کھلے چھوڑ کر یہ کہے کہ میں نے سب راستوں کو برابر حیثیت دے دی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اپنے بچوں کیلئے ایسا مکان بنانے کی ترکیب صرف کسی ذہنی مریض ہی کو سوجھ سکتی ہے ورنہ دنیا کا کوئی بھی شخص چاہے کتنا ہی آزادی کا دلدادہ کیوں نہ ہو ایسی حرکت نہیں کرتا بلکہ مکان بناتے وقت تمام احتیاطی تدابیر (safety-measures) اختیار کرتا ہے تاکہ جس شے (یعنی زندگی کے ہلاک ہو جانے) کو وہ برا سمجھتا ہے اس کی روک تھام کی جا سکے اور لوگوں کو اس بات کا زیادہ سے زیادہ پابند بنایا جا سکے کہ وہ ایسا طرز عمل اختیار کریں جسکے نتیجے میں انکے ہلاکت میں پڑنے کے امکانات کم از کم اور حصول خیر کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوسکیں۔ پس اس اصول پر اس دعوے کی مضحکہ خیزی بھی جانچی جاسکتی ہے کہ اسلام plurality of goods کا حامی ہے۔ وہ ایسے کہ ایک طرف تو اسلام پوری قوت کے ساتھ

اپنے لئے یہ دعوی کرے کہ صرف میں ہی حق ہوں باقی سب باطل ہیں نیز صرف میرا ہی راستہ حقیقی کامیابی اور نجات کا ضامن ہے باقی سب جہنم و بربادی کے راستے ہیں (**من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین** : آل عمران۳: ۸۵)، لیکن اس کے بعد اس اصولی دعوے کی مخالفت کرتے ہوئے اپنے معاشرے میں جہنم اور بربادی کی طرف لے جانے والی باقی تمام باطل قوتوں کا راستہ نہ صرف یہ کہ کھلا چھوڑ دے بلکہ ان کے فروغ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بھی فراہم کرے۔ آخر دنیا میں وہ کون شخص ہے جو جس شے کو شر سمجھتا ہے پھر اسے پھیلنے کی مکمل آزادی اور حق بھی دے دے؟ ایسی بے وقوفی کی امید تو ایک عام انسان سے بھی نہیں کی جاسکتی چہ جائیکہ اسکی نسبت اللہ اور اسکے رسول کی طرف کرنے کی جسارت کی جائے۔ اسلام کے نزدیک انسان کا اصل مسئلہ بیماری یا غربت نہیں بلکہ اپنے رب کا انکار اور اس سے سرکشی و بغاوت ہے اور بغاوت کا فروغ کبھی بطور پالیسی اختیار نہیں کیا جاتا۔ اس رویے کی وضاحت اس مثال سے کی جاسکتی ہے کہ جب کبھی یہ کہا جائے کہ ٹی وی بے حیائی اور فحاشی کو فروغ دے رہا ہے تو یہ عجیب وغریب فلسفہ سننے کو ملتا ہے کہ 'بھائی ٹی وی پر تو مذہبی چینلز بھی آتے ہیں، تو جو چاہے فلموں اور گانوں کے بجائے ان چینلز کو دیکھ لے'۔ اس فلسفے کا بوداپن اوپر بیان کی گئیں تفصیلات سے واضح ہو جانا چاہئے۔ اس مثال میں اصل سوال یہ نہیں کہ آیا ٹی وی پر مذہبی پروگرام آتے ہیں یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اگر فحاشی و عریانی پھیلانا برائی اور جرم ہے تو اسکے فروغ کو بطور ایک 'حق' اور 'پالیسی' کیسے اختیار کرلیا جائے؟ اس دلیل کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم افیون اور چرس بیچنے والے کو بھی اپنے کاروبار کے فروغ کی کھلی چھٹی دے دیں کیونکہ وہ بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ بھائی بازار میں کھانے کی بے شمار اشیاء موجود ہیں، لوگ چاہیں تو میری چرس کے بجائے انہیں استعمال کرلیں۔

آزادی کی مذہبی توجیہات:

اکثر مسلم مفکرین قرآنی آیت **فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر** (تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے، **کھف ۱۸: ۲۹**) سے ماخوذ شدہ جبر وقدر کی بحث پر مبنی مذہبی تصور آزادی کو مغربی تصور آزادی سے خلط ملط کرکے اسلام میں آزادی و جمہوریت بطور ایک مستقل

قدر کا اثبات کرتے ہیں۔ اس آیت میں جس آزادی کا ذکر ہے اسکا مطلب ہے ارادہ خداوندی کے مظہر تصوارت خیر وشر کو اپنانے کی آزادی، یعنی اللہ تعالی نے انسان کی ہدایت کا انتظام کر دینے کے بعد اسے اس بات پر مجبور نہیں کر دیا کہ وہ لازماً خیر ہی کو اپنائے بلکہ اسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اپنے رب کا فرمانبردار بنے یا باغی۔ البتہ اس آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ اگر وہ اپنے ارادے سے کفر اختیار کرے گا تو وہی خیر بن جائے گا بلکہ اسے اسکی سزا بھگتنا ہوگی جیسا کہ پوری آیت سے واضح ہے جو یوں ہے **قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر انا اعتدنا للظلمین نارا** (فرما دیجئے کہ حق تو وہی ہے جو تمہارے رب کی طرف سے آیا ہے، تو جو چاہے اس حق کو مان لے اور جو چاہے انکار کر دے، ہاں ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کیلئے آگ تیار کر رکھی ہے)۔ اسکے مقابلے میں مغربی تصور آزادی کا مطلب ہے خیر وشر کی تعیین کا حق۔ آسان لفظوں میں مذہبی جبر وقدر کی بحث میں آزادی کا مطلب ہے پہلے سے طے شدہ خیر یا شر میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار (choice between good and bad)، جبکہ مغربی تصور آزادی کا مفہوم ہے تعیین خیر کا حق (right to define good and bad OR choice of choice)۔ اوپر بیان کردہ آیت کی طرح قرآنی آیت **لا اکراہ فی الدین** ('دین میں کوئی زبردستی نہیں' بقرۃ ۲:۲۵۶) کا مفہوم بھی قریب قریب وہی ہے جیسا کہ مکمل آیت سے عین واضح ہے۔ اس آیت کو یہ عمومی معنی پہنانا کہ دین کے کسی معاملے میں کوئی جبر ہے ہی نہیں انتہائی غلط معنی ہیں کیونکہ اس تشریح کے بعد اسلام کے تمام معاشرتی و سیاسی احکامات کالعدم ہو جائیں گے۔ مثلا اسلامی ریاست میں کوئی شخص چوری کرے اور جب ہاتھ کٹنے کی باری آئے تو کہہ دے **لا اکراہ فی الدین**۔ اسی طرح اس آیت سے تمام تصورات زندگی کی اخلاقی و معاشرتی مساوات (plurality of goods) کا اصول نکالنا بھی غلط ہے کیونکہ اگر صرف اسی آیت کو پورا پڑھ لیا جائے تو اس نظریئے کی تردید ہو جاتی ہے۔ مکمل آیت کا ترجمہ یہ ہے:

> ''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں، بے شک ہدایت گمراہی سے خوب واضح ہوگئی ہے، پس جو کوئی طاغوت (بندگی کا انکار کرنے والے) کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا تو اسنے ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے

والا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے، اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا وہ انہیں (جہالت کی) تاریکیوں سے (ہدایت کی) روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے۔ اور جنہوں نے (ہدایت کا) انکار کیا انکے ساتھی طاغوت ہیں جو انہیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں، یہی لوگ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے'' (بقرۃ۲:۲۵۶)

قرآن نے ہدایت و خیر کیلئے لفظ 'نور' مفرد اور گمراہی کیلئے 'ظلمات' جمع استعمال کر کے یہ بتا دیا کہ حق اور خیر اصلاً صرف ایک ہیں جبکہ جہالت کی کئی شکلیں ہیں۔ خوب یاد رہے کہ ارادہ خداوندی سے باہر یا اس سے ماوراء کسی حق اور خیر کا کوئی وجود ہے ہی نہیں، خیر اور حق وہی ہے جسے اسلام خیر اور حق کہتا ہے نیز اسلامی نظام زندگی میں ارادہ خداوندی سے متصادم تصورات ہرگز بھی مساوی معاشرتی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ انہیں لازماً وہی پوزیشن اختیار کرنا ہوتی ہے جس کیلئے قرآن صاغرون (حالت مغلوبیت، توبۃ۹: ۲۹) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصورات زندگی میں آزادی (اور اسی لئے مساوات) کوئی بنیادی قدر نہیں بلکہ یہاں اصل قدر عبدیت ہے کیونکہ اہم بات یہ نہیں کہ میں جو چاہنا چاہوں چاہ سکنے پر قادر ہوں یا نہیں بلکہ یہ ہے کہ میں وہ چاہتا ہوں یا نہیں جو خدا چاہتا ہے کہ میں چاہوں۔ اسلام آزادی (اور اسی لئے مساوات) کو بطور کسی ایسی معاشرتی قدر قبول نہیں کرتا جو ریاست سے اس بات کا تقاضا کرے کہ وہ خیر کے معاملے 'غیر جانبدار' ہو کر تمام تصورات خیر کے 'حقوق' کا 'مساوی' تحفظ کرے، بلکہ اسلامی ریاست کا تو مقصد ہی اس خیر کو جو ارادہ خداوندی کی صورت میں نازل ہوا تمام دیگر تصورات خیر (جو درحقیقت شر ہیں) پر غالب کر دینا ہے نہ کہ انکے ساتھ مفاہمت کرنا اور خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کر کے انہیں مساوی حیثیت عطا کر دینا (هو الذی ارسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ، فتح۴۸: ۲۸)۔ اسکے مقابلے میں مغرب میں آزادی اعلیٰ ترین خیر ہے کیونکہ انکے مطابق اصل حیثیت اس چیز کی نہیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں بلکہ اس کی ہے کہ آپ جو چاہنا چاہیں چاہ سکیں۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ کہ سیکولر ریاست خیر کے معاملے میں غیر جانبدار ہوتی ہے ایک جھوٹا دعویٰ ہے کیونکہ خیر کے معاملے میں غیر جانبداری کا

رویہ ممکن ہی نہیں۔ سیکولر ریاست بھی ایک مخصوص تصور خیر کو تمام دیگر تصورات خیر پر بالاتر کرنے کی ہی کوشش کرتی ہے اور وہ تصور خیر آزادی ہے، یعنی یہ تصور کہ تمام تصورات خیر مساوی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا کہ تمام تصورات خیر مساوی ہیں غیر جانبداری کا رویہ نہیں بلکہ بذات خود خیر کا ایک مستقل مابعد الطبیعیاتی تصور ہے کہ 'اصل خیر تمام تصورات خیر کا مساوی ہونا ہے'، اور اسی تصور خیر کے تحفظ اور فروغ کی لبرل جمہوری دستوری ریاست پابند ہوتی ہے۔ یہ سمجھنا کہ لبرل جمہوری ریاست کوئی tolerant ریاست ہوتی ہے ایک فریب ہے کیونکہ اپنے دائرہ عمل میں یہ صرف انہیں تصورات خیر کو برداشت کرتی ہے جو اسکے اپنے تصور خیر (یعنی تمام تصورات خیر کی مساوات و لایعنیت) سے متصادم نہ ہو، اور ایسے تمام تصورات خیر جو کسی ایک چاہت کو بقیہ تمام چاہتوں سے بالاتر سمجھ کر اسکی برتری کے قائل ہوں انکی بذریعہ قوت بیخ کنی کر دیتی ہے جسکی مثال طالبان کی حکومت پر بمباری سے عین واضح ہے۔ درحقیقت خیر کے معاملے میں لبرل جمہوری ریاست بھی اتنی ہی dogmatic (راسخ العقیدہ) اور intolerant ہوتی ہے جتنی کوئی مذہبی ریاست کیونکہ دونوں ہی اپنے تصورات خیر سے متصادم کسی نظریئے کی بالادستی کو روا نہیں رکھتیں۔ خوب یاد رہے کہ تمام تصورات خیر کی لایعنیت کا مطلب غیر جانبداری نہیں بلکہ سرمائے کی بالادستی (عمل تکاثر) بطور اصل خیر کا اقرار ہے کیونکہ آزادی کو خیر ماننے کا مطلب بڑھوتری سرمائے کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں اور ہیومن رائٹس کا حقیقی معنی ایسے تمام تصورات کا تحفظ کرنا ہے جو سرمائے کی بالادستی کو اصل الاصول مانتے ہوں۔ ہیومن رائٹس درحقیقت اس بات کا اقرار ہیں کہ فرد اپنی جان، مال اور رائے سب کو سرمائے کے سپرد کر دے۔ یہ اسی کا مظہر ہے کہ پختہ (matured) جمہوری ریاستوں میں ارادہ انسانی یعنی اسکے حق کی بالادستی تمام تصورات خیر پر غالب آ جاتی ہے اور کسی مخصوص خیر کی دعوت دینا ایک لایعنی اور مہمل دعوت بن کر رہ جاتی ہے۔ ایسی ریاستوں میں آپ کسی مخصوص خیر (مثلاً مذہبیت) کے اظہار کو 'بطور ایک حق' کے پریکٹس (Practice) تو کر سکتے ہیں مگر اسے دیگر تمام تصورات خیر اور زندگی گزارنے کے دوسرے طریقوں پر غالب کرنے کی بات نہیں کر سکتے کہ ایسا کرنا ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی ہے۔ آزادی بطور ایک مستقل اسلامی قدر ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام بھی تمام تصورات خیر کو مساوی حیثیت دیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کوئی برتر اور مکمل نظام زندگی نہیں بلکہ ایک ایسے اعلیٰ نظامہائے

زندگی کا حصہ ہے جس میں تمام تصورات خیر برابر ہوتے ہیں اور وہ نظام لبرل سرمایہ داری ہے۔خوب یاد رہے کہ اسلام آزادی کو بطور ذریعہ (freedom as resource) تو مانتا ہے کہ دیگر مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو یہ ذریعہ حاصل ہے کیونکہ اسکے بغیر جنت وجہنم کا سوال لایعنی ٹھرتا، لیکن اسے بطور ایک قدر (freedom as value) نہیں مانتا کیونکہ اصل قدر آزادی استعمال کرنے کا حق نہیں بلکہ اسے اپنے رب کے سپرد (surrender) کردینا یعنی اظہار عبدیت ہے۔پس ہمیں چاہئے کہ ہم چیزوں کی حقیقت کا علم حاصل کریں تاکہ آزادی، plurality of goods اور ملٹی کلچرلزم جیسے گمراہ کن تصورات کی نسبت اللہ اور اسکے رسول کی طرف کرنے سے بچ سکیں۔

اسلامی معاشرے میں غیر مسلمین کے حقوق:

اسلام میں ذمیوں کے حقوق کا تحفظ بھی اسلامی جمہوریت کے اثبات میں دیئے جانے والے دلائل میں سے ایک اہم دلیل ہے۔جدید مفکرین کے خیال میں اسلام میں آزادی اور ملٹی کلچرلزم کا ثبوت یہ حقیقت ہے کہ اسلام اپنی سرحدوں میں غیر مسلمین کو ذمی بن کر رہنے کی نہ صرف یہ کہ اجازت دیتا ہے بلکہ انہیں اپنے ذاتی معاملات میں اپنی اپنی مذہبی تعلیمات کے مطابق رسوم عبودیت ادا کرنے نیز کئی دیگر حقوق بھی عطا کرتا ہے جسکی تفاصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ سیکولر طبقہ لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے اس بات کو بار بار دھراتا ہے نیز ہمارا معذرت خواں جدیدیت پسند طبقہ بھی اس جال میں پھنس کر ذمیوں کے حقوق سے جمہوریت کا اثبات کرنے لگتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی جزوی حکم کی مصلحت کو سمجھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اسے اس اجتماعیت کے جز کے طور پر دیکھا جائے جسکا وہ حصہ ہے، اگر آپ اس جز کو اسکے اصل مقام سے اٹھا کر کہیں اور رکھ کر اسکے معنی تلاش کرنے لگیں تو آپ لازماً غلطی کریں گے۔انسانی آنکھ کا صحیح معنی اور مصلحت انسانی جسم ہی میں تصور کی جاسکتی ہے نہ یہ کہ اسے کسی دیوار پر ٹانگ کر اس کا معنی سمجھا جائے۔ایسے ہی ذمیوں کے احکامات کو بھی اسلام ہی کی تعلیمات میں سمجھنا ممکن ہے نہ کہ انہیں جمہوریت میں فٹ کرنے کی غرض سے سمجھا جائے۔اب دیکھئے اسلام اس بات کا مدعی ہے کہ میرے علاوہ سب راستے جہنم کے راستے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کے جس خطے میں اللہ تعالی مسلمانوں کو دارالاسلام قائم کرنے کا موقع

نصیب فرمادے اگر وہاں ایسے لوگ بھی آباد ہوں جو ابھی تک اسلام کی سچائی سے محروم ہیں تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ ظاہر ہے اسکے چار جوابات ممکن ہیں:

۱) انہیں ہر لحاظ سے برابر تسلیم کر کے یکساں مواقع فراہم کر دیئے جائیں

۲) انہیں قتل کر دیا جائے

۳) انہیں دارالاسلام کی سرحدں سے نکال باہر کیا جائے

۴) انہیں دارالاسلام میں اس لئے بسنے کا موقع دیا جائے کہ انہیں تبلیغ کے ذریعے آسانی سے دائرہ اسلام میں لایا جاسکے

ظاہر ہے پہلا جواب اسلام کے لئے قابل قبول نہیں کیونکہ اسکا مطلب تو اپنے اس دعوے ہی سے دستبردار ہوجانا ہے کہ اسلام ہی حق ہے۔ دوسرا جواب بھی اس لئے درست نہیں کہ اللہ تعالی نے یہ دنیا امتحان کے اصول پر قائم کی ہے، نیز اسلام انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہے بلکہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ جب کفر و الحاد کی اتھاہ گہرائیوں میں بھی ایک انسان کو قبول حق کی توفیق نصیب ہوسکتی ہے تو اس بات کی پوری امید کی جاسکتی ہے کہ درست تربیت اور صالح ماحول میسر آجانے پر انسان کسی بھی وقت اس حق کی طرف پلٹ سکتا ہے جو اسے ابدی ہلاکت سے بچانے والا ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ اسلام ایسے شخص کو اپنی سرحدوں سے باہر دارالکفر کی طرف نہیں دھکیلتا کہ یہ اسے جہنم کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے کیونکہ دارالکفر میں تو ایمان لانے کے مواقع دار الاسلام کے مقابلے میں کم ہو جائیں گے۔ لہذا اسلام اس بات پر تیار ہے کہ ایسے شخص کو دارالاسلام کی سرحدوں میں رہنے کی اجازت دے دی جائے تا کہ اسے حتی یسمع کلام الله کے مترادف اللہ کا پیغام سننے کا موقع مل جائے اور تبلیغ کے ذریعے دائرہ اسلام میں داخل کرلیا جائے۔ غیر مسلمین کو اپنی سرحدوں میں بسنے کی اجازت دینے کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام انہیں اپنے مساوی خیر سمجھتا ہے اور نہ ہی اسکا مقصد یہ ہے کہ انہیں اپنے کفر پر جمے رہنے نیز اپنی آنے والی نسلوں تک اسے منتقل کرنے کا لائسنس دے دیا جائے۔ اسلام کی اصولی تعلیمات کے مطابق بھی دیکھا جائے تو ہر غیر مسلم کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کرنا ضروری ہے، اب اپنی سرحدوں سے باہر نکالنا درحقیقت خود اپنے اس کام کو مشکل بنانے کے ہم معنی ہے۔ پس معاشرے میں زندگی گزارنے کیلئے عرف کے مطابق جو حقوق ہونے چاہئیں اسلام ذمیوں کو ایسے تمام حقوق دیتا ہے اور یہی ان حقوق کا اصل پس منظر ہے۔

☆ فقہ المعاملات پر اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد مجلّہ ☆

حکومت کیلئے عوامی تائید کی شرط:

اثبات جمہوریت کیلئے ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ اسلام میں حکمرانوں کیلئے یہ لازم ہے کہ انہیں عوامی تائید حاصل ہو اور ووٹنگ اسی تائید کے حصول کا ایک طریقہ ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اسلام میں حکومت کیلئے 'عوامی تائید کی شرط' کس دلیل شرعی کی بنیاد پر اخذ کی گئی ہے۔ اصولیین جس شے کو 'شرط' کہتے ہیں اس کیلئے جس درجے کی قطعی دلیل (خصوصاً علمائے احناف کے ہاں) کی ضرورت ہوتی ہے اگر ایسی کوئی دلیل ہے تو پیش کی جائے، ورنہ محض قیاسات اور تاویلات کی بنیاد پر کسی بات کو شرط قرار دینے کی اسلامی علمیت میں کوئی گنجائش موجود نہیں۔ اگر 'عوامی تائید' 'حق حکمرانی کی لازمی شرط' ہے تو معاذاللہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ ہی کی حکومت ناجائز قرار پائے گی۔ بتایا جائے کہ ان میں سے کس کو عوامی تائید کے سنہرے اصول پر 'منتخب' کیا گیا تھا؟ سب جانتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان پہلے کیا گیا بیعت بعد میں ہوئی۔ انکی اس تقرری کا فیصلہ عوام یا انکے منتخب کردہ نمائندوں میں سے کس نے کیا تھا؟ پھر دیکھئے حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی میں ہی حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ اس مقام پر بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فیصلہ آپ نے صحابہ سے 'مشورے کے بعد' کیا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے 'مشورے سے پہلے' فیصلہ کر کے اکابر صحابہؓ کو اپنی رائے پر اعتماد میں لیا تھا۔ اگر صحابہ سے بات کرنے کا مقصد منصب خلافت کیلئے موزوں شخص کا مشورہ (اور وہ بھی ایسا کہ جس پر عمل کرنا خلیفہ پر لازم ہوتا ہے) لینا ہوتا تو یقیناً حضرت عمرؓ خلیفہ مقرر نہ ہوتے کیونکہ مشورہ دینے والوں کی رائے تو یہی تھی کہ اس منصب کیلئے عمرؓ موزوں نہیں کہ آپؓ بہت سخت مزاج ہیں لیکن اس رائے کے باوجود حضرت ابوبکرؓ نے صحابہ کو سمجھا لیا کہ نہیں میرا فیصلہ ٹھیک ہے۔ پھر دیکھئے لوگوں کو منصب خلافت کیلئے حضرت عمرؓ کا چھ افراد کی مشاورتی کمیٹی بنانا تو یاد ہے مگر یہ یاد نہیں رہتا کہ یہ عمرؓ ہی ہیں جنہوں نے وہ کمیٹی بنانے سے پہلے فرمایا تھا کہ اگر فلاں فلاں صحابی آج زندہ ہوتے تو میں انہیں تمہارا امیر مقرر کر کے جاتا۔ اگر خلافت عام آدمی کا مسئلہ ہے اور عوامی تائید اسکی لازمی شرط ہے تو نعوذ باللہ ابوبکر و عمرؓ سے بڑے آمر اسلامی تاریخ میں پیدا نہیں ہوئے۔ پھر ایک لمحے کیلئے مان لیجئے کہ حضرت عمرؓ کی

تقرری مشورے ہی سے عمل میں آئی تھی، لیکن کن کے مشورے سے؟ کبار صحابہ کرام کے یا عوام کے؟ اگر عوامی تائید اور وہ بھی 'پچاس فیصد سے زیادہ اکثریتی تائید' خلافت اسلامی کے جائز قیام کی شرط لازم ہے تو ریاست مدینہ شاید قائم ہی نہ ہو پاتی کیونکہ گنتی کے اعتبار سے رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی ہی بادشاہ بنتا۔ اگر محمد بن قاسمؒ بھی 'عوامی تائید' کی اس غلط فہمی کا شکار ہوتا تو کبھی ہندوستان میں اسلامی ریاست کی بنیاد نہ ڈالتا۔ پھر 'عوامی تائید کی شرط' کے اس فلسفے کے مطابق ہندوستان اور اندلس کی اسلامی ریاستیں یقیناً غیر اسلامی ٹھریں گی کیونکہ ان علاقوں میں مسلمانوں کو کبھی عوامی اکثریت حاصل نہیں ہوئی۔ کیا آج تک کسی عالم نے یہ کہا ہے کہ مدرسے کا 'مہتمم' بننے کیلئے مدرسے میں کام کرنے والے تمام افراد (بشمول اساتذہ، انتظامی آفسر، چپڑاسی)، طلباء اور اردگرد کے علاقے کے افراد کی تائید شرط لازم ہے؟ کیا کسی یونیورسٹی کے ڈین کا تعین اس بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اسے سب لوگوں کی تائید حاصل ہو؟ کیا مسجد کے امام صاحب کا استحقاق امامت عوامی رائے اور تائید کے ساتھ مشروط سمجھا گیا ہے؟ اگر امامت صغریٰ کیلئے عوامی تائید کوئی شرط نہیں تو امامت کبریٰ (جو اس سے بھی بڑی اور نازک ذمہ داری ہے) کیلئے عوامی رائے اور مرضی کی شرط کہاں سے آ گئی؟ اور تائید بھی اس عوام کی جسکی حالت یہ ہے کہ وہ مقلدین محض ہیں، جنہیں خبر ہی نہیں کہ مقاصد الشریعہ کیا ہیں اور شارع کی رضا حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے، فیاللعجب۔ عوامی نمائندگی کا مطلب 'پچاس فیصد سے زیادہ آبادی کی اکثریت' بذات خود جمہوری مفکرین بھی نہیں لیتے کیونکہ اس صورت میں تو امریکہ میں بھی کوئی حاکم نہیں بن سکے گا جسکی وجہ یہ ہے کہ الیکشن کا turn over (آبادی کا وہ حصہ جو ووٹ ڈال کر جمہوری عمل میں حصہ لیتا ہے) بڑی مشکل سے چالیس فیصد ہوتا ہے جسکا مطلب یہ ہوا کہ اس جمہوری نظام ہی کو ساٹھ فیصد عوام کی تائید حاصل نہیں لہذا اسے بند کر دیا جانا چاہئے۔ ہمیں یہ بات ماننے میں کوئی اعتراض نہیں کہ حکمرانوں کو عوامی تائید حاصل ہونا اچھی بات ہے، آخر اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی کہ سارے عوام متقی اور صالح ہوں اور انکی تائید حاصل ہو، مگر اسلامی نظریہ ریاست میں یہ ایک اضافی (extra) صفت تو ہو سکتی ہے لیکن کوئی لازمی شرط نہیں کیونکہ اسلامی علمیت میں اس مفروضے کی کوئی دلیل موجود نہیں کہ خلافت کی بنیاد ہی عوامی تائید ہے نیز یہی اسلام کا اصل طریقہ حکمرانی ہے۔

☆ فقہ المعاملات پر اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد مجلہ ☆

اسلامی نظریہ ریاست کی جمہوری تعبیر کی کئی دیگر شکلیں (shades) بھی ہیں جن سب کا احاطہ کرنا یہاں مقصود وممکن نہیں۔ جو مسلم مفکرین جمہوریت کے اندر اسلامی روح تلاش کرنے کے خواہاں ہیں وہ درحقیقت جمہوریت کو سمجھے ہی نہیں کیونکہ جمہوریت محض ووٹ ڈالنے یا رفع اختلاف کے کسی ادارے وغیرہ کا نام نہیں، بلکہ انسان کے 'حق' کو 'خیر' پر فوقیت دینے، یعنی ارادہ انسانی کی بالادستی کو اصل خیر سمجھنے کا نام ہے۔ ان مفکرین کی غلطی جمہوریت کو غیر اقداری (value-neutral) اور ٹیکنیکل شے سمجھنا ہے جو ہر قسم کے مقاصد اور خیر کے حصول میں مددگار ہوسکتی ہے، یعنی انکے خیال میں جمہوریت گویا ایک ایسا خالی صفحہ ہے جس پر آپ جس چیز سے جو چاہیں لکھ لیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت ایک ایسی سلیٹ ہے جس پر ایک مخصوص شے سے ہی تحریر کندہ کی جاسکتی ہے جو بھی اسے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا یہ اسے مجبور کردے گی کہ اسپر اسی شے سے لکھے جس سے لکھنے کیلئے یہ کارآمد ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم جمہوریت اور جمہوری جدوجہد کی حقیقت پہچانیں اور اس بات کا شرح صدر کے ساتھ ادراک حاصل کریں کہ جمہوریت ہرگز بھی کوئی ایسا ریاستی ڈھانچہ فراہم نہیں کرتی جس کے ذریعے کسی بھی نظام زندگی اور مقصد کا حصول ممکن ہے کیونکہ جس چیز کو یہ ممکن بناتی ہے وہ ارادہ خداوندی پر مبنی خیر کی نہیں بلکہ 'انسانی حق کی ہر خیر پر بالادستی' ہے اور کفر وشرک کی یہ وہ شکل ہے جسے plurality of goods کے خوبصورت نام سے پیش کیا جاتا ہے نیز اس کے نتیجے میں جو نظام زندگی تشکیل پاتا ہے وہ سرمایہ داری کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ پس ہمیں چاہئے کہ ہم انسانیت پرستی کو اسکی تمام تر شکلوں میں کلیتًا رد کریں کیونکہ انسانیت کا غلبہ درحقیقت سرمایہ داری کی بالادستی کا دوسرا نام ہے جسکا لازمی نتیجہ عبدیت اور مذہب کا زوال ہے۔ ہمارا یہ دعوی محض نظریاتی یا خیالی دعوی نہیں، بلکہ مغربی دنیا میں جہاں جہاں بھی انسانیت پرستی کے مظاہر عام ہوئے (مثلاً سائنس وٹیکنالوجی، نیشنلزم، لبرلزم، اشتراکیت وغیرہ کی شکل میں) وہاں مذہب ایک بالادست معاشرتی حقیقت نہیں بلکہ دیگر کھیل تماشوں کی مانند محض نفسیاتی سکون حاصل کرنے کا ایک ذاتی حربہ بن کر رہ گیا ہے جسے مغرب میں Spritual luxury کہا جانے لگا ہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ:

☆ آزادی رد ہے عبدیت کا

☆ مساوات رد ہے نظام ہدایت وتزکیہ نفس کا

☆ ترقی رد ہے دنیا کے دارالامتحان ہونے اور معرفت خداوندی کے امکان کا

☆ ہیومن رائٹس رد ہے حقوق العباد کا

☆ Plurality of goods رد ہے اسلام کے الحق ہونے کا

☆ Tolerance رد ہے ایمان اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا

☆ جمہوریت رد ہے خلافت کا

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں حقیقت حال سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مباحث مضمون سے متعلق مطالعے کیلئے درج ذیل حوالہ جات دیکھئے

۱۔ آزادی اور اسکا منفی اور مثبت مفہوم سمجھنے کیلئے دیکھیں

Berlin, I. (1973), "Two concepts of liberty" in *Political Philosophy*, edited by Anthony Quinton, Oxford University Press, UK

Mill J. S. (1865), *On Liberty,* Longmans Green and Co., London

۲۔ لبرل جمہوری نظام میں خیر وحق کی ترتیب باہمی نیز انسانیت پرستی کی انفرادی واجتماعی تعبیرات سمجھنے کیلئے دیکھیں

Rawls J. (1971), *A Theory of Justice,* Harvard University Press

Mulhall S. and Adam Swift (1992), *Liberals and Communitarians*, Blackwell publishers, Oxford

Sandel M. (1982), *Liberalism and the Limits of Justice*, Cambridge University Press

۳۔ لبرل جمہوری نظام کے جواز کیلئے دیکھیں

Locke, John (1956), *The Second Treatise of Government*, ed. J. W. Gough, New York

Rousseau J. (1987), *The Social Contract*, tr. by Maurice Cranston, Penguin

Baradat, Leon (2000), *Political Ideologies*, 7th Ed., Prentice Hall, New Jersey

☆ فقہ المعاملات پر اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد مجلّہ ☆

۴۔ جمہوری اقدار کی اسلام کاری کا تازہ ترین نمونہ اور دینی قیادتوں کے سیکولر سیاسی لائحہ عمل کے جواز کی نوعیت سمجھنے کیلئے دیکھئے: ماہنامہ ترجمان القرآن (فروری، مارچ اور اپریل ۲۰۰۸) میں پروفیسر خورشید احمد صاحب کے مضامین 'اسلام اور جمہوریت' ، 'قیادت کا امتحان' اور حال ہی میں چھپنے والی کتاب Islam and Secular Mind میں پروفیسر صاحب کا تحریر کردہ مقدمہ

۵۔ اسلامی معاشیات کا عمومی خاکہ سمجھنے کیلئے دیکھئے: مولانا تقی عثانی (۱۹۹۳)، اسلام اور جدید معیشت وتجارت، دارالاشاعت کراچی

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو مے بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اپنے پیاروں کو عالم بناؤ.................. اپنا پیارا ملک بچاؤ
بغیر علم کے اللہ کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی.......... دنیاوی علم اللہ کی معرفت عطا نہیں کرتا
یہ دینی علم ہی کی شان ہے کہ وہ اللہ سے ملاتا ہے.......... دنیاوی علم محض وسیلۂ روزگار ہے۔
علماء کی قدر کیجئے.......... عالم بنئے.......... جاہل رہنے پر قناعت مت کیجئے۔
تحریکِ فروغ علم

☆ فقہ المعاملات پر اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد مجلّہ ☆